

ہست ہی نمایاں، واضح، کھلی اور کٹھن آزمائش تھی۔“

پس معلوم ہوا کہ خالق کائنات کی طرف سے موت و حیات کا یہ نظام ابتلاء، آزمائش، امتحان اور جانچنے اور پرکھنے کے لئے تخلیق فرمایا گیا ہے۔ ساتھ ہی اسی آیت میں اس جانچ اور پرکھ کی غایت بھی بیان کر دی گئی کہ ﴿أَيُّكُمْ أَحْسَنُ عَمَلًا﴾ یعنی وہ (اللہ تعالیٰ) یہ دیکھے کہ تم میں سے کون بہتر عمل کرتا ہے۔ تم جو اس دنیا میں اپنے خالق کی ذات سے محبوب کر دیئے گئے ہو اور اصل حقائق تمہاری نگاہوں سے او جھل کر دیئے گئے ہیں۔ حقیقت الحقائق ذاتِ باری تعالیٰ ہے ﴿ذَلِكَ بِأَنَّ اللَّهَ هُوَ الْحَقُّ﴾ الحق اللہ کی ذات ہے اور وہ آنکھوں سے او جھل ہے۔ اب تمہاری عقل، نظر اور تفکر و تدبیر کی جو صلاحیتیں عطا کی ہیں، جو بصیرت باطنی عنایت کی ہے، تو ایک تو ان کے ذریعے ہم کو پہچانو۔ ان آنکھوں سے دیکھے بغیر دل کی آنکھوں سے ہمیں دیکھو اور ہماری معرفت حاصل کرو — پہلی آزمائش یہ ہے۔ یہ تو گویا نظری، فکری، عقلی اور علمی آزمائش ہے کہ آیا تم حجابات ہی سے محبوب ہو کر رہ جاتے ہو، پردوں ہی کے نقش و نگار دیکھنے میں محو ہو جاتے ہو، بیس کی ظاہری آرائش و زیبائش تمہیں مہسوت کر دیتی ہے اور تم اسی کے اندر گم ہو کر رہ جاتے ہو، جس کو علامہ اقبال مرحوم نے یوں تعبیر کیا ہے کہ ط ”کافر کی یہ پہچان کہ آفاق میں گم ہے“ ہم نے تمہیں پردوں میں رکھا ہے۔ پھر پردے بھی بڑے خوش نمایاں۔ اس زمین میں جو کچھ ہے اس کو ہم نے اس کی زینت کے لئے بنایا ہے۔ ﴿إِنَّا جَعَلْنَا مَا عَلَى الْأَرْضِ زِينَةً لَّهَا﴾ گویا اس کائنات میں جو کچھ ہے وہ دراصل اس زمین کی زیبائش و آرائش اور سنگھار ہے۔ اس میں بھی ایک آزمائش ہے، ابتلاء ہے، امتحان ہے۔ تو پہلی آزمائش عقل اور فکر و نظری آزمائش ہے۔ انسانی کی جو قوتِ نظری ہے اس کا امتحان ہے کہ یہ انسان اپنے رب، مالک اور خالق کو پہچانتا ہے یا نہیں — جبکہ دوسری آزمائش انسان کے ارادے، عمل اور سیرت و کردار کی پختگی سے متعلق ہے۔

اب اگر اپنے مالک و خالق حقیقی کو پہچان لیا ہے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلتا چاہئے کہ انسان اسی سے دل لگائے، اسی سے لو لگائے، اسی کو مطلوب و مقصود بنائے، اس کی عبادت و اطاعت کرے۔ اب قدم قدم پر امتحانات آئیں گے۔ دنیا کی چیزیں انسان کو اپنی طرف کھینچیں گی۔ بقول شاعرؒ ”اُدھر جاتا ہے دیکھیں یا اُدھر پروانہ آتا ہے!“ وہ ان آرائشوں اور زیبائشوں کی طرف توجہ کرتا ہے یا ہماری طرف متوجہ ہوتا ہے۔ ان کو مطلوب و مقصود سمجھتا ہے یا ہمیں مطلوب و مقصود بناتا ہے۔ اگر اس کے سامنے یہ متبادل (alternative) راستے رکھ دیئے جائیں کہ یا اللہ کے راستے کو چھوڑ دیا اپنے عزیزوں کو چھوڑ دو، وطن کو خیر باد کہہ دو، تو دیکھیں وہ کون سا راستہ اختیار کرتا ہے۔ وہ وطن اور اپنے اعزہ و اقارب کے حق میں فیصلہ کرتا ہے یا اللہ کے حق میں فیصلہ کرتا ہے! اگر اس کے سامنے یہ دورا ہا آ جاتا ہے کہ یا والدین کو چھوڑے یا اللہ کی توحید کو چھوڑے، تو دیکھیں کہ کس کو چھوڑتا ہے! اگر اس کے سامنے یہ معاملہ آجائے کہ اپنی زندگی کی قربانی قبول کرے یا اللہ کے ساتھ اپنے تعلق کا رشتہ توڑ دے اور معبودانِ باطل کی پرستش کرنے لگے، تو دیکھیں کہ اس کے بارے میں اس کا فیصلہ کیا ہوتا ہے؟ — اور اگر اس کے سامنے یہ مرحلہ آجائے کہ دنیا کی جو محبوب ترین شے ہو سکتی ہے اس کی محبت اور اللہ کی محبت کے درمیان فیصلہ کرنے کو کہا جائے تو دیکھیں وہ کدھر کا رخ کرتا ہے۔

رخِ روشن کے آگے شمع رکھ کر وہ یہ کہتے ہیں

اُدھر جاتا ہے دیکھیں یا اُدھر پروانہ آتا ہے!

یہ کُل امتحان ہے — جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ پہلا امتحان عقل و فکر کا امتحان ہے۔

دوسرا امتحان ارادے، نیت، سیرت و کردار اور عمل کا امتحان ہے۔ تو یہ ہے امتحان اور یہ ہے زندگی کی اصل غرض و غایت ﴿خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيٰوةَ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ط﴾ — اس کی ترجمانی بھی علامہ اقبال مرحوم نے بڑی

خوبصورتی سے کی ہے۔ وہ کہتے ہیں ~

قلم ہستی سے تو ابھرا ہے مانندِ حباب!

اس زیاں خانے میں تیرا امتحان ہے زندگی!

یہ جو ہماری زندگی ہے یہ حباب کی مانند ہے، بڑی عارضی، بڑی فانی، پانی کا بلبلہ، جو اب پھٹا کہ اب پھٹا۔ بلبلے کی اس سے زیادہ اور کیا حیثیت ہے۔ اس حیاتِ دنیوی کی پائیداری پر کوئی اعتماد نہیں ہو سکتا کہ یہ کب تک رہے گی۔ لیکن جتنی دیر بھی یہ بلبلہ قائم رہے اس کی بھی ایک غرض و غایت ہے۔ وہ بھی عبث نہیں ہے۔ ذرا اس کا خاکہ کیجئے۔ مثلاً کاتھو، کیجئے، جس کو علامہ مرحوم نے اس شعر میں قلم سے تعبیر کیا ہے۔ پس یہ زندگی ایک آزمائش اور امتحان سے زیادہ کوئی حیثیت اور وقعت

نہیں رکھتی ~ یہ گھڑی محشر کی ہے تو عرصہ محشر میں ہے

پیش کر غافلِ عمل کوئی اگر دفتر میں ہے!

حیاتِ ابراہیمی: امتحان و آزمائش کی مثالِ کامل

اس امتحان کی جو کامل و مکمل مثال قرآن مجید پیش کرتا ہے وہ حضرت ابراہیم (علی نبینا وعلیہ السلام) کی زندگی ہے۔ چنانچہ سورۃ البقرۃ کی آیت ۱۲۴ کا آغاز ان الفاظ میں ہوتا ہے: ﴿وَإِذِ ابْتَلَىٰ إِبْرَاهِيمَ رَبُّهُ بِكَلِمَاتٍ فَأَتَمَّهُنَّ﴾ اور یاد کرو کہ جب آزمایا ابراہیم کو اس کے رب نے بڑی بڑی باتوں میں تو وہ ان سب میں پورا اتر گیا۔ — یہاں لفظ ابتلاء آگیا۔ اس کے معنی ہیں کسی کو آزمانا، امتحان و آزمائش میں ڈالنا۔ — یہاں لفظ بِكَلِمَاتٍ میں توین تنکیر کے لئے آئی ہے، یعنی اس نے اس کو نکرہ بنا دیا ہے، اور تنکیر عربی زبان میں تفضیم کے لئے یعنی کسی چیز کی عظمت و شان کو بیان کرنے کے لئے آتی ہے۔ چنانچہ بِكَلِمَاتٍ میں بڑے بڑے اور کٹھن امتحانات کا مفہوم شامل ہو گیا ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اس کے رب نے بڑے سخت اور